صفات الٰہی صرف زبان پر نہیں بلکہ دل میں گھومنی چاہئیں
حق کو نہ چھوڑیں خواہ کیسی مشکل آئے۔

(خطبہ جمعہ فرمودہ 7/ جولائی 1995ء بمقام بیت الفضل لندن)

تشہد و تعوذ اور سورۃ فاتحہ کی تلاوت کے بعد حضور انور نے فرمایا:

گزشتہ دو خطبوں کے دوران میں مثالوں سے یہ بات واضح کر رہا ہوں کہ کس طرح اسماءِ باری تعالیٰ کا بنیادی تعلق سورۃ فاتحہ ہی میں مندرج اسماء سے ہے اور بعض دفعہ ایک ہی اسم سے جو سورۃ فاتحہ میں مذکور ہے ایک اور اسم پھوٹتا ہے بعض دفعہ ان کے اجتماعی اثر سے ایک اسم پھوٹتا ہے اور جو بنیادی صفات ہیں اللہ تعالیٰ کی، جو ان اسماء میں سے ہیں جو غیر معمولی شان اور قوت کی صفات رکھنے والے ہیں وہ تمام سورۃ فاتحہ میں مذکور صفات سے مل کر بنتے ہیں۔ اس لیے اگر آپ کو یہ سمجھ آ جائے کہ کس طرح وہ ہر ایک صفت سے تعلق رکھتے ہیں تو اس سے یہ بات بھی سمجھ آ جاتی ہے کہ اس اسم کے ساتھ انسان اپنا تعلق جوڑنے کی خواہش کرے جس کے تعلقات سورۃ فاتحہ میں مذکور اسماء سے ہیں تو ہر اسم کے رستے سے وہ تعلق قائم کیا جائے گا اور کامل تعلق وہ ہوگا جو تمام بنیادی صفات کے رستے سے قائم ہو، وہ سب سے اعلیٰ اور افضل تعلق ہوگا۔

اس ضمن میں مَیں ''الحق'' کی مثال دے رہا تھا کہ خدا سچا ہے یہاں تک کہ اس کا نام محض سچا نہیں بلکہ حق ہے۔ اس کی جو بنیادی صفت ہے جس کو ہم اسم بھی کہتے ہیں ''اسم الٰہی'' وہ سچ بولنے والا نہیں بلکہ ''الحق'' ہے۔ یعنی مجسم سچ، اس میں سچ کے سوا کچھ بھی نہیں۔ اس کی تمام صفات حقہ

ہیں اور کامل طور پر سچ ہیں۔اس پہلو سے ظاہر ہے کہ اس لفظ حق کا تعلق سورۃ فاتحہ میں مذکور تمام اسماء سے ہونا چاہئے تھا۔اس کی بعض مثالیں میں پہلے دو خطبات میں پیش کر چکا ہوں۔ میں نے یہ بھی بتایا تھا کہ بظاہر رحمٰن کا تعلق حق سے کوئی نہیں ہے لیکن اگر آپ غور کریں تو رحمٰن کا حق سے تعلق بھی بنتا ہے۔رحمانیت کے تقاضوں کے وقت بسا اوقات انسان حقیقت کے بیان سے ہٹ جاتا ہے۔ایک ماں کو بچے سے محبت ہے، ایک باپ کو بیٹے سے محبت ہے، وہاں رحمانیت کا تقاضا یہ ہے یعنی جس کو وہ اپنی رحمانیت سمجھتا ہے یا سمجھتی ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ رحم کی خاطر اس بچے کو جھوٹ بول کر بچایا جا سکتا ہے تو بچا لیا جائے۔ تو انسان کے لئے یہ ابتلاء ہیں اور اللہ تعالیٰ کے لیے کوئی ابتلاء نہیں ہے اس کی وضاحت میں پہلے بھی کر چکا ہوں اس لئے اس کو دہراتا نہیں صرف یاد کروا رہا ہوں آپ کو کہ اللہ تعالیٰ کو کسی موقع پر بھی جھوٹ بولنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ وہ جوان چار بنیادی صفات سے مزین ہو جو رب بھی ہو، رحمٰن بھی ہو، رحیم بھی ہو اور مالک بھی ہو اس کو کسی موقع پر بھی کسی جھوٹ سے کام لینے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔مگر انسان حمید بھی ہونا چاہتا ہے ایسا رب بننا چاہتا ہے جو صاحب حمد ہو، ایسا رحمٰن بھی بننا چاہتا ہے جو صاحب حمد ہو، ایسا رحیم بھی بننا چاہتا ہے جو صاحب حمد ہو، ایسا مالک بھی بننا چاہتا ہے جو صاحب حمد ہو اور ان تمام امور میں عاری ہے اپنی ذات میں نہ وہ حقیقت میں قابل تعریف رب بن سکتا ہے نہ قابل تعریف رحمٰن نہ قابل تعریف رحیم نہ قابل تعریف مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ (البقرہ: 4) تو اس مشکل کا حل کیا ہے۔اس ضمن میں مَیں پچھلے دو خطبات میں مثالیں دے کر واضح کر چکا ہوں کہ اس مضمون کو سمجھ جائیں تو حل بھی اسی وقت سمجھ آ جاتا ہے۔

امر واقعہ یہ ہے کہ ہر وہ صفت باری تعالیٰ جس کے درمیان اور انسان کے درمیان فاصلہ ہے اس کی اس طرح Immitation کرنے سے وہ فاصلہ مٹتا ہے جس طرح خدا میں وہ صفت ظاہر ہوتی ہے اس سے ہٹ کر اگر وہ جلوہ دکھائیں گے جو بظاہر رحمانیت کہلا سکتا ہے مثلاً، تو اس کے بظاہر موجود ہونے کے باوجود خدا سے تعلق قائم نہیں ہوگا۔یہ جو پیچ دار بات ہے اس کو اسی مثال کے حوالے سے میں دوبارہ کھولتا ہوں جو میں نے حضرت میر حامد شاہ صاحب کی پیش کی تھی۔میر حامد شاہ صاحب کی مثال سے یہ بات واضح تھی کہ آپ اپنے بیٹے سے محبت رکھنے کے باوجود اس محبت سے اس حد تک مغلوب نہیں ہوئے کہ عدل کا دامن چھوڑ دیا ہو اور حق کو چھوڑ دیا ہو۔ چونکہ اس پہلو سے وہ خدا کے

قریب ہوئے اس لئے آپ کی رحمانیت اور خدا کی رحمانیت میں ایک تشابہ پیدا ہو گیا اس لئے جیسا کہ Tuning Fork میں جہاں ایک نغماتی صوت پیدا کرنے والا آلہ ایک خاص لہر پر نغمہ پیدا کرتا ہے اگر بعینہٖ اسی مزاج کا آلہ ہو اور اس پہلے آلے کو آپ ہاتھ رکھ کر بند بھی کر دیں تو دوسرے آلے سے وہی آواز اُٹھنی شروع ہو جاتی ہے تو صفاتی ہم آہنگی ایک ایسا گہرا سائنسی راز ہے اور اب تو کھلی ہوئی حقیقت بن چکا ہے کہ صفات باری تعالیٰ میں بھی یہی مضمون کارفرما ہے اور قطعیت کے ساتھ کارفرما ہے یہ کوئی اتفاقی حادثے کے طور پر نہیں بلکہ ایک یقینی صورت حال کے طور پر آپ کو جلوہ گر دکھائی دے گا۔

اس مثال کے ضمن میں میں ایک اصلاح بھی کر دینا چاہتا ہوں۔ حضرت مصلح موعودؓ نے جو خطبے میں وہ واقعہ بیان فرمایا تھا ایسا اور جگہ بھی کئی دفعہ ہوا ہے، مجھ سے بھی بارہا ہو جاتا ہے، مجھ سے تو زیادہ ہی ہوتا ہے کہ ایک واقعہ سنا ہے اس کا عمومی تاثر تو یاد ہے مگر بعض تفاصیل یاد نہیں اور چونکہ خطبے سے پہلے بسا اوقات تیاری کا موقع نہیں ملتا اور بعض دفعہ تیاری کی بھی ہو کسی مضمون پر تو جو خدا تعالیٰ کی تقدیر چاہتی ہے وہی ہوتا ہے ایک مضمون میں پڑ کر آپ ایک سمت پہ چل پڑتے ہیں اور اس سے رُک نہیں سکتے پھر، ایک دھارے میں بہتے چلے جاتے ہیں۔ ضمناً جو واقعات یاد آتے ہیں وہ ضروری نہیں ہوتا کہ بعینہٖ اسی صحت کے ساتھ ہوں جیسا کہ اصل میں پیش آئے تھے مگر یہ بات ضروری ہے کہ جس مقصد کے لئے وہ پیش کئے جاتے ہیں اس مقصد کو ثابت کرنے اور حاصل کرنے میں اگر معمولی لفظی غلطیاں رہ بھی گئی ہوں تب بھی وہ پورا کام کرتے ہیں۔ پس اس واقعہ سے متعلق تصحیح یہ ہے کہ حضرت میر حامد شاہ صاحب کی ایک بھانجی تھی سیدہ فضیلت بیگم اور ان کے بھائی کے بیٹے تھے۔ سید میر عبدالسلام صاحب جو انگلینڈ کی جماعت میں بھی بہت عرصہ رہے ہیں اور ایک مشہور کرکٹر کے طور پر بھی ان کا نام کرکٹ کی جو تاریخی کتابیں ہیں ان میں بھی لکھا گیا ہے، ان کی اولاد ہے یہاں۔ ماشاء اللہ ان میں سے ایک آپا شاما ہیں جو بچپن سے ہمارے گھروں میں سیالکوٹ سے آکر مہمان ٹھہرا کرتی تھیں، بڑی بہن کی طرح ان سے بہت گہرا پرانا تعلق ہے، انہوں نے گھر میں جو واقعہ سنا اور ان کے سارے خاندان میں جو جس طرح رائج ہے انہوں نے مجھے بتایا کہ حضرت مصلح موعودؓ نے معلوم ہوتا ہے جب سنا تھا تو بعض باتیں خطبے میں بیان کرتے وقت ذہن میں نہیں رہیں اس لئے چونکہ ایک

تاریخی واقعہ ہے میں اس کی درستی کرنا چاہتی ہوں۔ جب انہوں نے بیان کیا تو مجھے بھی یاد آ گیا کہ اسی طرح میں نے بھی بچپن ہی میں سنا تھا اس لئے اس واقعہ کی تصحیح ہونی چاہئے مگر جیسا کہ میں نے بیان کیا ہے اور بھی بار ہا ایسی باتیں ہوتی ہیں جو بنیادی طور پر غلط نہیں مگر کچھ سقم رہ جاتے ہیں۔

اصل واقعہ یہ تھا کہ ایک حد تک حضرت مصلح موعودؓ کا بیان چلتا ہے بعد کے ایک واقعہ کا حضرت مصلح موعودؓ کو یا علم نہیں ہوا یا اس وقت ذہن سے اتر گیا ہے۔ جس ڈپٹی کمشنر کی بات ہو رہی تھی کہ وہ بہت ہی سختی سے انصاف چاہتا تھا اپنے نام و نمود کی خاطر، انصاف کی خاطر نہیں یا برٹش حکومت کا رعب قائم کرنے کے لئے نہ کہ حصول انصاف کے لئے حضرت مصلح موعودؓ کو جو تأثر تھا وہ یہ تھا کہ کسی ڈپٹی کمشنر نے وہ فیصلہ دیا جو اصل واقعہ ہے وہ اس طرح نہیں ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جب اس ڈپٹی کمشنر نے جس کے متعلق مشہور تھا کہ یہ حکومت کا نام و نمود قائم کرنے اور اپنے انصاف کا چرچا کرنے کی خاطر بعض دفعہ ضرورت سے زیادہ غیر منصفانہ سختی کرتا ہے۔ اس کی عدالت میں حضرت میر حامد شاہ صاحب سپرنٹنڈنٹ تھے اور اس زمانے میں ایک انگریز ڈپٹی کمشنر کی عدالت میں سپرنٹنڈنٹ ہونا آج کل کے چیف سیکرٹری ہونے سے بھی بڑی بات سمجھی جاتی تھی۔ اس نے یہ سوچا کہ ان کے بیٹے سے ایک قتل ہو گیا ہے مشہور یہ ہوا ہے مقدمہ پیش ہو گیا ہے اور اگر میں نے اس کے حق میں فیصلہ دے دیا تو میری بدنامی ہو گی کہ میں چونکہ اپنے سپرنٹنڈنٹ سے تعلق رکھتا ہوں، اس کا لحاظ کرتا ہوں، اس کی لحاظ داری کی خاطر میں نے انصاف چھوڑ دیا۔ تو اس بات پر تلا بیٹھا تھا کہ میں ضرور اس کو پھانسی چڑھاؤں گا اور حضرت میر صاحب پر اتنا اعتماد تھا سچائی کے لحاظ سے کہ خود ان کو بلایا اور ان سے کہا کہ یہ واقعہ سنا ہے کہ ایسے ہوا ہے۔ انہوں نے کہا سُنا تو میں نے بھی ہے مگر میں موقع پر موجود نہیں تھا تو انہوں نے کہا کہ پھر اگر اس نے کیا ہے تو اپنے بیٹے کو کہو کہ سچ بولے۔ میر صاحب نے اپنے بیٹے جن کا نام سید سعید احمد تھا ان کو بلا کر نصیحت کی اور انہوں نے وعدہ بھی کر لیا۔ یہاں تک تو بات درست ہے اسی طرح تھی۔ اگلی بات جو سہواً حضرت مصلح موعودؓ سے بیان کرنی رہ گئی وہ یہ تھی کہ سیّد احمد پر جب اس کے دوستوں اور سیالکوٹ کے اور بااثر خاندانوں نے زور ڈالا اس کو کہا کہ تم اپنے باپ کی باتوں میں آ کر کیوں اپنی جان کھوتے ہو تم جانتے ہو کہ قتل عمد نہیں ہے۔ اس لئے عدالت میں کبھی ہاں نہ کرنا، اس کے بغیر ثبوت ہی کوئی نہیں ہے۔ اگر تم منکر ہو گئے تو عدالت تمہارے خلاف فیصلہ دے ہی

نہیں سکتی تو وہ بیچارے اس عرصے میں پھر گئے۔ جب عدالت میں پیش ہوئے اور ڈپٹی کمشنر نے پوچھا تو انہوں نے کہا نہیں غلط بات ہے میں نے تو نہیں ایسا کیا۔ حضرت میر صاحب کی جو شان تقویٰ ہے وہ اس طرح ظاہر ہوتی ہے اسی وقت کھڑے ہوئے اور پہلے چونکہ پوچھ چکے تھے، پتا تھا اب گواہی دے سکتے تھے ڈپٹی کمشنر سے کہا یہ جھوٹ بول رہا ہے اس سے پوچھیں کہ جو تم نے دایاں ہاتھ جیب میں ڈالا ہوا ہے یہ کیوں ڈالا ہوا ہے نکالو تو سہی، اس کا انگوٹھا دیکھیں جس زور سے اس نے مکا مارا تھا اسی وقت سے اس کا انگوٹھا جو ہے زخمی ہے اور اسی لیے آپ کی عدالت میں جیب میں ہاتھ چھپایا ہوا ہے تاکہ پتا نہ لگ جائے۔ جب ہاتھ نکلوایا تو واقعی انگوٹھے پر وہ بہت زور سے، جو شدت سے مکا مارا تھا تو بعض دفعہ ضرب آجاتی ہے اس کی وجہ سے جو نشان تھا وہ سوجا ہوا تھا تو جج نے وہیں بات ختم کر دی اور اس کے بعد اس کی نیت ظاہری طور پر یہی تھی کہ ان کو پھانسی چڑھا دے گا۔ اب حضرت میر صاحب اپنی اولاد سے بہت محبت کرتے تھے یہ میں رحمانیت کی مثال دے رہا ہوں کہ وہ واقعہ مجھے اس ضمن میں کیوں یاد آیا اور اس کا کیا گہرا تعلق ہے۔ سچائی اور رحمانیت کا رشتہ کیا ہے۔ ان کو بہت پیار تھا اپنی اولاد سے ویسے ہی بہت شفیق تھے انہوں نے جانماز بچھالی۔ رات کو رو رو کے گریہ وزاری شروع کی کہ اے میرے آقا تیری خاطر میں نے سچ بولا ہے تو حق ہے مگر تو جانتا ہے کہ میرے بچے کا قصور بھی کوئی نہیں اور مرا تو اس کے ہاتھوں ہے مگر بالعمد قتل نہیں ہے اس لیے بچانا بھی تو نے ہی ہے جس دن فیصلہ سنایا جانا تھا اس سے ایک دن پہلے اچانک اس ڈپٹی کمشنر کی تبدیلی ہوگئی اور فیصلہ سنائے بغیر اسی طرح رہ گیا۔ جو دوسرا ڈپٹی کمشنر آیا ہے اس نے جب کیس دیکھا تو اس نے کہا، اس کے الفاظ یہ تھے کہ یہ کیا پاگلوں والی بات ہے، ہم بھی تو کبھی جوان ہوا کرتے تھے ہمیں پتا ہے کہ جوانی کے جوش میں مقابلے ہو جاتے ہیں لڑائیاں ہو جاتی ہیں ارادہ تو قتل کا نہیں ہوا کرتا اس لیے کیس ہی Dismiss کیا جاتا ہے اس میں کوئی جان نہیں۔

تو یہ جو واقعہ ہے یہ دراصل اس بات پر گواہ ہے کہ رحمانیت جھوٹ کا تقاضا نہیں کرتی بلکہ سچ کو آزماتی ہے اور جو اس آزمائش میں پورا اُترے گا وہی سچا رحمٰن ہے اور اسی کا رحمٰن خدا سے تعلق قائم ہوتا ہے اور وہ بڑی شان کے ساتھ اس تعلق کو پھر ظاہر بھی فرما دیتا ہے۔ رحمانیت کے تعلق میں میں نے یہ بھی بیان کیا تھا کہ چونکہ صاحب حمد ہے وہ، رحمٰن بھی صاحب حمد ہے اگر رحمٰن سے کوئی ایسی بات

سرزد ہو جائے جو قابل تعریف نہ ہو تو وہ رحمٰن صحیح معنوں میں نہیں رہتا۔ مگر قرآن کریم میں براہ راست بھی رحمانیت کا حق سے ایک تعلق ظاہر کیا گیا ہے سورۃ الرحمٰن کو آپ پڑھ کر دیکھیں اس میں جتنے بھی مختلف دلچسپ انداز میں اللہ تعالیٰ کے احسانات کا ذکر ہے وہ سب دراصل رحمانیت کی تفسیر ہیں اور اسی لیے بار بار یہ تکرار ہے فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۱۴﴾ (الرحمٰن: 14) وہ تمہارا رب جو رحمٰن ہے اس کی کس نعمت کا تم انکار کرو گے۔ اور اس میں جو سزائیں ہیں وہ بھی نعمت کے طور پر درج ہیں کیونکہ وہ سزائیں نہ ہوں تو نظام کائنات درہم برہم ہو جائے اور سارے معصوم لوگ مارے جائیں اور مصیبت میں گرفتار ہو جائیں۔

تو یہ جو تعلقات ہیں بڑے باریک اور بڑے گہرے ہیں لیکن قرآن کریم میں ہر بات کھول کر پیش کر دی گئی ہے سورۃ الرحمٰن ہی میں شروع میں اللہ تعالیٰ رحمٰن خدا کا تعارف کرواتے ہوئے فرماتا ہے۔ وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيْزَانَ ﴿۸﴾ اَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيْزَانِ ﴿۹﴾ (الرحمٰن: 9-8) اس نے آسمان کو بلند کیا اور میزان قائم کی یعنی عدل قائم کیا اور عدل کا ترازو قائم کیا۔ یہ دونوں باتیں میزان میں آجاتی ہیں اَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيْزَانِ تا کہ تم عدل میں کبھی بھی بے اعتدالی نہ کرو۔ ساری کائنات کی بناء عدل پر رکھ دی ہے اور رفعتوں کا تعلق عدل سے ہے ورنہ زمین میں بھی تو وہ میزان پایا جاتا ہے۔ ذکر فرمایا ہے وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيْزَانَ دیکھو رفعتوں کی طرف تم کس طرح مرغوب ہو کر دیکھتے ہو لیکن یہ نہیں دیکھتے کہ تمام رفعتوں کی بناء میزان پر ہے اگر میزان نہ رہے تو کوئی رفعت باقی نہیں رہتی اور نصیحت یہ ہے اَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيْزَانِ کہ تم میزان میں کبھی بھی بے اعتدالی سے کام نہ لینا۔

پس اس موقع پر اس آیت کی تفسیر کھل کر ہمارے سامنے آجاتی ہے ایک طرف حضرت میر صاحب کا اپنے بچے کے لئے رحم تھا جو جوش مار رہا تھا دوسری طرف یہ تعلیم تھی کہ رحمٰن خدا ہی نے عدل بنایا ہے اور یہ کھول کر تمہارے سامنے اس لئے پیش کر رہا ہے تا کہ تم کبھی بے اعتدالی نہ کرنا۔ تو جو رحمٰن کے حقیقی معنی تھے ان کا گہرا تعلق انصاف اور سچائی سے تھا۔ اگر رحمانیت کے نام پر، رحم کے نام پر آپ سچائی کو چھوڑ دیتے تو رحمٰن سے تعلق کٹ جاتا۔ پس آپ نے بھی اگر رحمٰن خدا سے تعلق قائم کرنا ہے تو حق کے رستے سے تعلق قائم ہوگا فرضی رحمانیت کے ذریعے نہیں ورنہ جتنے دنیا میں

جرائم ہیں اکثر رحمانیت ہی سے پھوٹ رہے ہیں یعنی وہ رحمانیت جو خدا کی نہیں ہے جو عدل سے عاری ہے اور بندوں کی رحمانیت ہے۔

پس ایک اور سبق اس آیت کریمہ سے ہمیں یہ ملتا ہے کہ کوئی رحم جو عدل کے تقاضوں کو چھوڑ کر کیا جاتا ہے وہ جائز نہیں ہے پہلے عدل ہے پھر رحم ہے۔ چنانچہ اسی ترتیب سے قرآن کریم نے یہ ارشاد فرمایا ہے کہ پہلے عدل، پھر احسان، پھر اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى (النحل:91)۔ پہلا قدم عدل کا ہے پھر احسان کا ہے پھر ایتاء ذی القربیٰ ہے۔ عدل سے اوپر کے دونوں مقامات رحمانیت کے تابع ہیں۔ احسان بھی رحمانیت کے تابع ہے اور اِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى بھی رحمانیت کے تابع ہے لیکن عدل کی بنیاد نہ ہو تو یہ دو منزلیں اوپر بن ہی نہیں سکتیں۔ اور عدل سچائی کا دوسرا نام ہے، حق کا دوسرا نام ہے۔ پس سورۃ فاتحہ میں جو صفات ہیں یا اسماء الٰہی ہیں فی الحقیقت ان کا تمام صفات باری تعالیٰ سے گہرا تعلق ہے۔ یہ کوئی فرضی کہانی نہیں ہے اور اسے سمجھنے کے نتیجے ہی میں آپ ان چاروں صفات سے تعلق قائم کر سکتے ہیں اور خدا کی تمام صفات سے اس واسطے سے تعلق قائم کر سکتے ہیں لیکن اس کی راہ میں کچھ مشکلات در پیش ہیں کچھ امتحانات ہوں گے۔ کہیں ربوبیت سے تعلق قائم کرنے کی راہ میں بے شمار مسائل آئیں گے، بے شمار دقتیں پیش آئیں گی اور آپ کے امتحان ہوں گے۔ اللہ رب ہے یہ حق بات ہے لیکن آپ بھی رب بنتے ہیں اپنی اولاد کے لئے، اپنے عزیزوں کے لیے ان کی بھی ربوبیت کرتے ہیں یہ بھی اپنے دائرے میں حق بات ہے لیکن اللہ کی ربوبیت کسی جھوٹ کی محتاج نہیں ہے۔ اگر آپ کی ربوبیت جھوٹ کی محتاج ہے اگر رزق پیدا کرنے میں بددیانتیاں ہیں، دھوکے بازیاں ہیں اور دوسروں کے رزق چھینے گئے ہیں، ربوبیت کی بھی نفی ہو جاتی ہے، رحمانیت کی بھی ہو جاتی ہے، رحیمیت کی بھی ہو جاتی ہے اور مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ کی بھی، یعنی اگر اس مضمون کو بڑے غور سے آپ پڑھیں گے تو بات وہاں جا کے ختم ہوگی۔

پس صفات باری تعالیٰ سے تعلق زبان سے نام جپنے سے نہیں ہو سکتا۔ پتا نہیں کن لوگوں کے دماغ میں یہ بات آگئی کہ ذکر الٰہی اس کو کہتے ہیں۔ قرآن کریم کی رو سے ذکر الٰہی وہ ہے تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ (الزمر:24) کہ اس سے انسان کے چمڑے پہ جھرجھریاں طاری ہو جاتی ہیں جو ڈوبتا ہے دل میں اور ایک زلزلہ پیدا کر دیتا ہے اور وہ تبھی ہو سکتا ہے کہ تسبیح کے دانے پر انگلیاں نہ چل

رہی ہوں بلکہ صفات باری تعالیٰ دل میں گھوم رہی ہوں اور اپنے جلوے دکھا رہی ہوں دماغ اس کے نتیجے میں Excite ہو جائے اور غور کر رہا ہو اور پھر اپنے عمل میں وہ جاری ہونا شروع ہو جائے۔ ایسے مقامات آتے ہیں کہ جب انسان سمجھ تو لیتا ہے لیکن عمل میں جاری کرنے کی راہ میں ایک روک پیدا ہو جاتی ہے اپنی کمزوری، اپنی مشکلیں اور یہ اکثر انسانوں کے ساتھ، اکثر دفعہ یہی معاملہ ہوتا ہے اس کا خلاصہ وہی شعر ہے اس شعر میں بیان ہوا ہے کہ

جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی (دیوان غالب:249)

یہ تو نہیں کہ مجھے پتا نہیں کہ طاعت و زہد کا ثواب کیا ہے لیکن طبیعت نہیں آتی اس طرف۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے سورۃ فاتحہ ہی کے حوالے سے اس کا حل پیش فرمایا۔ آپ نے فرمایا کہ سورۃ فاتحہ میں خدا سے تعارف حاصل کرنے کے نتیجے میں یہ غلط ہے کہ تم اس سے تعلق جوڑ سکو گے۔ ہر قدم پر تمہاری راہ میں مشکلات ہوں گی۔ روزمرّہ کے رزق کے ذرائع ہیں ان میں بھی آپ کو مشکلات پیش آتی ہیں، اپنے مقاصد دوسرے ہیں جو حل کرنے ہیں ان میں بھی مشکلات پیش آتی ہیں، رحیم بننے میں بھی مشکلات پیش آتی ہیں، رحیم وہ ہے جو جس کا بھی جتنا کام آپ کے ذمہ ہے اس کی محنت سے بڑھ کر اس کو پھل دو لیکن جب آپ لوگوں کے کام کا حق اپنے پاس رکھنے لگ جاتے ہیں اور اکثر دنیا میں Exploitation اسی کا نام ہے، اکثر دنیا میں غریب کو اس کی محنت کا پھل نہیں دیا جاتا اور انسان اس پہلو سے رحیم نہیں رہتا۔ اگر کوئی کہے کہ جو بھی کسی ملک کے قوانین یا قواعد ہیں ان کی رو سے میں نے ایک مزدور کا، ان کی محنت کا پھل دے دیا تو اس میں بھی ایک دھوکا ہے۔ بعض ملکی اقتصادی حالات ایسے ہیں کہ جہاں مزدور کی مزدوری ساری قوم نے دبائی ہوئی ہے اور اتنی تھوڑی ہے کہ اس پر ایک غریب پل ہی نہیں سکتا۔ تو ایک انسان اگر آنکھیں کھول کر دیکھے، اپنے نفس پر غور کرے اور یہ سوچے کہ کیا میں اس مزدوری کو قبول کر کے یہ محنت کر سکتا ہوں تو اس کا دل گواہی دے گا، اس کے اندر ایک نظام موجود ہے، وہ گواہی دے گا کہ نہیں ایسا نہیں ہوگا۔ پھر یہ عذر رکھ کر کہ اقتصادی طور پر اتنی ہی مزدوری بنتی ہے میں نے حق ادا کر دیا یہ جھوٹ ہے۔ رحیم سے آپ کا تعلق قائم نہیں ہو سکتا قانون آپ کو پکڑے یا نہ پکڑے۔ زیادہ سے زیادہ آپ یہ عذر رکھ سکتے ہیں کہ میں نے

کوئی جرم نہیں کیا مگر نہ بھی کیا ہو تو رحیم خدا سے اپنا تعلق تو کاٹ لیا اور اس کے نتیجے میں بہت سی باتوں سے محروم رہ گئے اور رحیمیت کا جو حق سے تعلق ہے اس مضمون میں آپ ڈوبے تو آپ کو وہ دکھائی دینے لگا۔ قانون کا عذر حق نہیں ہے۔ حقیقت حال کی تہہ میں اترنا اور کسی معاملے کو سمجھ کر اس کے مطابق اس کا سلوک کرنا یہ حق ہے اور یہی سچائی ہے۔ پس اللہ تعالیٰ اگر اسی طرح عذر رکھ کر کہ تم نے یہ کام اتنا کر لیا اس کی مزدوری مل گئی اگر اپنی مخلوقات سے سلوک کرتا تو ساری مخلوق بھوکی مر جاتی یا کچھ بھی اس کو حاصل نہ ہوتا۔ بعض دفعہ ایک انسان میں زیادہ کرنے کی طاقت ہی نہیں ہوتی اور ضرورتیں زیادہ ہیں۔ اللہ رحیمیت میں اس بات پر نظر رکھتا ہے کہ جتنا کسی نے کچھ کیا ہے، توفیق کے مطابق کر دیا اب میں ضرورت کے مطابق اس کو دوں اس لئے رحیمیت کا صرف یہ مطلب کرنا کہ پورا پورا بدلہ دیتا ہے یہ درست نہیں ہے۔ اس میں تو رحم کی کوئی بات نہیں وہ تو عدل کا معاملہ ہے اور حضرت مسیح موعود علیہ الصلوۃ والسلام اس مضمون کو کھول چکے ہیں کہ اللہ کو مالک کے طور پر پیش فرمایا گیا ہے عادل کے طور پر نہیں اگرچہ مخلوق کے حوالے سے اس نے عدل کے نظام کو عام کر دیا۔ کوئی بھی مخلوق عدل کے تقاضوں سے باہر نہیں رکھی لیکن خود عدل سے بالا ہے۔ جس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ غیر عادل ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ عدل کے تقاضوں سے بڑھ کر دینے والا ہے رحمٰن بھی ہے رحیم بھی ہے اور مالک بھی ہے اس لئے ناپ تول کے نہیں دیتا جتنا کوئی کرتا ہے اتنا تو لازماً اس میں شامل ہوگا اگر وہ زیادہ دیا جائے گا۔ اس لئے اس کو عادل نہیں کہتے اس کو محسن کہہ دیں گے اِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى کا سلوک کرنے والا کہہ دیں گے مگر اگر وہ ناپ تول کر برابر دے تو پھر وہ عادل کہلائے گا اور اس لحاظ سے اس کو پھر ہر گناہ کی سزا بھی دینی پڑے گی وہاں بھی مالکیت کام آتی ہے۔

ہم اگر ہمارے سامنے گناہ آئیں یا جرائم پیش ہوں اور ہم قانون کی نمائندگی میں فیصلہ کرنے کی کرسی پر بٹھائے جائیں تو ہم چونکہ مالک نہیں ہیں اس لئے وہ فیصلہ نہیں کر سکتے۔ یعنی ایسا فیصلہ نہیں کر سکتے جو کسی پہلو سے بھی ظاہری عدل کے خلاف ہو۔ بیچ میں جو کچھ بھی ہو ہم مجاز نہیں ہیں اور حقیقی مجاز اللہ ہی ہے۔ اس وجہ سے اگر آپ بات کو سمجھنے کے باوجود سمجھتے ہیں کہ حق کے اندر یہ ہے لیکن خدا ہی کے بنائے ہوئے قوانین کے تابع مجبور ہیں کہ اس حق کو جاری نہیں کر سکتے تو آپ کا کام یہاں ختم ہو جاتا ہے۔ پھر مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ کا کام شروع ہو جاتا ہے پھر اس کا کام ہے کہ

اپنی ملکیت کی شان آپ کے حق میں دکھائے اور جو آپ چاہتے ہوئے بھی خدا کی خاطر کرنے سے رک گئے تھے وہ اللہ آپ کے لئے جاری فرمادے۔ پس وہ جو مثال تھی حضرت میر صاحب کی اس میں یہ بات بھی بڑی کھل کے سامنے آ گئی۔ جانتے تھے کہ اندر سے حق یہ ہے کہ اس کو سزا نہیں ملنی چاہئے جانتے تھے کہ میں بے اختیار ہوں میں مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ نہیں ہوں اس لئے مالک کا کام مالک کے سپرد کروں جو میرا کام ہے میں اتنا ہی کروں اور پھر مالک سے مانگوں اور مالک رحیم ہے عدل سے بالا رحیم ہے یعنی عدل کے تقاضوں کو قربان کر کے رحیم نہیں بلکہ عدل کے تقاضوں سے بڑھ کر دینے والا ہے۔ پس اس پہلو سے جو خدا کی شان ظاہر ہوئی ہے وہ غیر معمولی تھی کوئی اتفاقی حادثہ نہیں تھا۔ یہ اعجاز تھا ایک کہ ایک دن پہلے دستخط کرنے سے اس کا فوری تبادلہ کر دیا جاتا ہے اور جو دوسرا آتا ہے وہ معاملہ فہم ہے اور قانون اس کو اجازت بھی دیتا کہ معاف کردے۔

پس خدا تعالیٰ سے تعلق جوڑنے کے لئے حق پر قائم ہونا ضروری ہے جس کا ایک دوسرا نام عدل بھی ہے اور ان تمام صفات کے حوالے سے آپ پر جو آزمائشیں آئیں ان پر پورا اتریں گے تو پھر آخر آپ اس خدا سے تعلق جوڑ لیں گے جو تمام تر حق ہے اور آپ کی تائید میں پھر وہ ایسے نشان دکھائے گا جس کی کوئی مثال اس دنیا میں دکھائی نہیں دیتی۔ یہ جو میں آپ کے سامنے باتیں بیان کر رہا ہوں، آئے دن اس کی مثالیں میرے سامنے آنی شروع ہوگئی ہیں۔ کئی احمدی لکھ رہے ہیں کہ آپ نے فلاں خطبے میں خدا کی فلاں صفت کا ذکر کیا، فلاں اسم کی تشریح کی، ہمیں پہلے علم نہیں تھا کہ یوں ہونا چاہئے۔ ہم نے جب اس کے مطابق کیا تو اللہ کا یہ احسان ہم پر نازل ہوا۔ یہ خدا تعالیٰ کی طرف سے قرب کا ایسا نشان دکھایا گیا جو ہمارے سامنے یوں لگتا تھا کہ ہم نے آمنے سامنے اس حقیقت کو پالیا ہے کہ خدا کے جس اسم سے تعلق قائم کریں اس کا پھل ضرور ملتا ہے۔ پس وہ شجر جو پھل دار ہو جائے اس شجر کو آپ جھوٹا کیسے کہہ سکتے ہیں وہ حق ہی حق ہے۔

اور خدا تعالیٰ کا جو شجر ہے جو خدا تعالیٰ کی صفات کے نتیجے میں قائم ہوتا ہے وہ ثمر دار بھی ہے اور ہر موسم میں پھل لانے والا ہے۔ اس لئے آپ ان باتوں پر غور کر کے، سمجھ کر عمل شروع کریں تو پھر دیکھیں کہ یہ کوئی فرضی تسبیح کے موتی پھیرنے والے صوفی نہیں بنیں گے۔ ایسے اللہ سے تعلق رکھنے والے بنیں گے جیسے ایک عاشق اور معشوق کا گہرا تعلق ہوتا ہے اور پھر وہ آپ کے سارے کام بنائے گا،

آپ کی تائید میں اترے گا اور جب آپ سے آزمائش لے گا یا آپ کی آزمائش کرے گا تو آپ کو طاقت بھی دے گا، آپ کو سہارا بھی دے گا کہ اس میں سے کامیابی سے گزر جائیں اور ناکام نہ ہوں اور یہ بھی اس رستے کی مشکلات ہیں یا آزمائشیں ہیں جن سے گزرنا پڑتا ہے۔ اگر یہ نہ ہوں تو پھر ہر کس و ناکس اسماء الٰہی کی طرف دوڑے گا اور سوسائٹی کی چھان بین نہیں ہوسکتی کہ کون سچا ہے کون جھوٹا ہے۔ جہاں لگے ہاتھوں فائدہ ہی فائدہ ہو وہاں تو بعض دفعہ جونسبتاً کم کردار لوگ ہیں وہ زیادہ جلدی پہنچا کرتے ہیں تو صفات الٰہی میں ہر قسم کے Valves اللہ تعالیٰ نے رکھ دیئے ہیں۔

یہ مضمون ایسا ہے جہاں Safety Valves لگائے گئے ہیں۔ باہر سے لوگ جو دیکھتے ہیں، ان کو آپ کے روحانی تجربات دکھائی نہیں دے رہے ہوتے ان کو صفات باری تعالیٰ سے تعلق جوڑنے والوں کی مشکلات نظر آ رہی ہوتی ہیں۔ وہ یہ دیکھ رہے ہوتے ہیں کہ فلاں جگہ مقدمے ہوئے اتنے آدمی ان کے پکڑے گئے یہ مصیبت پڑی جھوٹ نہ بولیں تو ان کے کام نہیں بن سکتے۔ تو وہ ساری مصیبتیں جو باہر کی آنکھ دیکھ رہی ہے وہ گندوں کو پرے رکھنے کے لئے ہے۔ اور ایک مومن کی اندر کی آنکھ ہے وہ بتا رہی ہے کہ باہر والے جس کو جہنم سمجھ رہے ہیں اس کے اندر تو رحمت ہی رحمت ہے اور اسی مضمون کو قرآن کریم میں دوسری جگہ اللہ تعالیٰ یوں بیان فرماتا ہے کہ بعض بد اور بعض نیکوں کے درمیان مرنے کے بعد ایک مکالمہ ہوگا بدلوگ یہ کہیں گے کہ اپنا نور ہمیں بھی تو دو ہم بھی اس سے کچھ فائدہ اٹھائیں۔ تم جو آگے بڑھ رہے ہو خدا کی راہوں میں ہمارا بھی کچھ انتظار کرو ہم بھی تمہارے نور سے فائدہ اٹھائیں۔ تو ان کو وہ جواب دیں گے کہ تم واپس لوٹ جاؤ جو نور تم چھوڑ آئے ہو وہ اب تمہیں مل نہیں سکتا اور اس کے بعد ان کے درمیان ایک دیوار قائم کردی جائے گی اور اس میں ایک دروازہ ہوگا۔ دیوار کی تو سمجھ آ گئی کہ روک بن گئی لیکن دروازہ کیوں ہے اس لئے کہ مغفرت کا تقاضا ہوگا کہ کئی ان میں سے بالآخر اس دروازے سے اندر جاسکیں اگر دروازہ ہی کوئی نہ ہو تو پھر تو ہمیشہ کے لیے وہ برباد ہو گئے۔ پھر فرمایا کہ وہ دیوار عجیب ہے کہ اس کے باہر کی طرف تو جہنم ہے اور بہت تکلیف دہ صورتحال ہے۔ اندر آئیں تو رحمت ہی رحمت ہے۔ تو یہی وہ مضمون ہے جو میں آپ پر کھول رہا ہوں کہ خدا کی راہ میں کوششیں کرنے والوں کے ساتھ یہ ہوتا ہے کہ جب وہ کوششیں کرتے ہیں تو ابتلا بھی آتے ہیں لیکن اللہ ان ابتلاؤں کو ٹال بھی دیتا ہے اور اس کے نتیجے میں اتنا رحمت کا

سلوک فرماتا ہے کہ وہ ابتلاء بالکل معمولی اور بے حقیقت دکھائی دینے لگتے ہیں۔ یہ ابتلاء اس لئے ضروری ہیں کہ اگر ہر تعلق کا جواب لازماً شیرینی ہی سے ملے تو پھر سب جھوٹے بھی اسی تعلق کی طرف دوڑیں گے کیونکہ ان کو تو اپنے نفس کی حاجت روائی چاہئے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے ایک دیوار قائم کر دی ہے بیچ میں، باہر کی دنیا دیکھتی ہے تو وہ سمجھتے ہیں جہنم ہی جہنم ہے اس دروازے کی طرف بڑھنا بڑی مصیبت ہے ان کے قدم باہر رک جاتے ہیں۔ جو اندر داخل ہو جاتے ہیں۔ کہتے ہیں مصیبتیں تو سب باہر کی طرف ہیں وہ دنیا ہے جو باہر رہ گئی ہے جو آگ میں جل رہی ہے ہمارے لئے تو رحمت ہی رحمت ہے۔

تو صفات باری تعالیٰ کے سفر میں ایسی مشکلات ضرور پیش آتی ہیں۔ لیکن اس یقین کے ساتھ آپ کو قدم آگے بڑھانا ہوگا کہ ایک دفعہ جب آزمائش سے آپ گزر جاتے ہیں تو پھر آپ کی بلائیں پیچھے رہ جاتی ہیں اور رحمتیں آپ کا انتظار کرتی ہیں۔ اس کے لئے ایک نور چاہئے اور نور نام ہے حق کا۔ نور اس چیز کو کہتے ہیں جو غلط اور صحیح میں ایک تمیز کر کے دکھا دے۔ اندھیروں کے مقابل پر روشنی ہوتی ہے اور قرآن کریم نے اسی لئے روشنی کا نام حق رکھا ہے فرمایا جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ؕ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا (بنی اسرائیل: 82) حق آ گیا ہے اور باطل بھاگ گیا ہے اب روشنی آتی ہے تو اندھیرے بھاگتے ہیں۔ دوسری جگہ اس مضمون کو اس طرح بھی بیان فرما دیا۔ تو وہ جو نور ہے سچائی کا نور ہے جو تفریق کرنے والا ہوگا پس آپ بھی ان معنوں میں سچے بنے بغیر اللہ تعالیٰ کی طرف حرکت نہیں کر سکتے، اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل نہیں کر سکتے۔

اور سچائی کا یہ حال ہے کہ مختلف پہلوؤں سے سچائی کی آزمائش زندگی بھر ساتھ رہتی ہے اور ہر میدان میں جو آپ جیتتے ہیں وہ قرب الٰہی میں آپ کو قریب تر کر دیتا ہے اللہ تعالیٰ کے۔ پس لامتناہی سفر ہے مگر اس سفر کی جزا ہر منزل پہ ملتی چلی جاتی ہے۔ پس یہ جو انسانی آزمائشیں ہیں اس راہ کی ان کے لئے اپنے آپ کو تیار کرنا ہوگا مگر پہچاننا ہوگا کہ آزمائش آتی کیسے ہے، کہاں کہاں آتی ہے؟ اب جیسا کہ میں نے بیان کیا ہے بعض دفعہ ربوبیت کی راہ سے آتی ہے بعض دفعہ ایک خاص مقصد کے حصول کی راہ میں یہ مشکل حائل ہو جاتی ہے کہ اگر سچ بولیں تو وہ مقصد شاید حاصل نہ ہو جھوٹ بولیں تو شاید حاصل ہو جائے۔

مجھے یاد ہے میں نے جرمنی میں ایک دفعہ خطبے میں جو اسائلم لینے والے ہیں ان کو نصیحت کی

تھی کہ اسائلم کی خاطر اگر آپ جھوٹ بولیں گے تو آپ کی ہجرت ضائع ہو جائے گی کوئی بھی فائدہ نہیں ہوگا اور نہ ادھر کے رہے اور نہ اُدھر کے رہے، گھر بار بھی گیا اور دین و دنیا سے بھی جاتے رہیں گے۔ اسائلم کی خاطر اگر آپ جھوٹ بولتے ہیں تو اس میں دو طرح کی ایسی باتیں ہیں جن میں آپ ناکام ہوئے۔ اوّل یہ کہ واپس جانے کا یہ خوف کہ گویا خدا یہاں تو آپ کو امن دے سکتا ہے وہاں امن نہیں دے سکتا یہ شرک کی ایک قسم ہے۔ خدا کی تقدیر ہے کہ خوف کے مقام سے دوسری طرف چلے جاؤ اس تقدیر کے تابع آپ نے سفر شروع کیا۔ دوسری تقدیر یہ ہے کہ جھوٹ نہیں بولنا اور سچے خدا پہ توکل کرنا ہے۔ اگر اس کا امن تمہیں ایک جگہ میسر نہیں آتا تو دوسری جگہ بھی نہیں آئے گا۔ اس لئے امین خدا کی ذات ہے اس کے سائے تلے تم نے حرکت کرنی ہے۔ اگر یہ باتیں سچی ہیں تو ہجرت سچی ہے اگر یہ نہیں ہیں تو ہجرت جھوٹی ہے پھر وہ ایک مشرک کی ہجرت بن جاتی ہے۔

چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ایک موقع پر اسی طرح سوال کیا گیا تھا ایک وادی میں آپؓ نے پڑاؤ ڈالا پتا چلا کہ وہاں پلیگ کی طرح کی کوئی بیماری پھیلی ہوئی ہے جو بہت ہی مہلک اور وبائی ہے اور آناً فاناً ہلاک کرتی ہے۔ آپ نے اسی وقت کوچ کا حکم دے دیا کہ ایک منٹ بھی یہاں نہیں ٹھہرنا ہجرت کر جاؤ، ایسی وادی میں جاؤ جو صحت مند فضا رکھتی ہو تو ایک صحابی نے عرض کیا اے امیر المومنین! کیا آپ خدا کی تقدیر سے بھاگ رہے ہیں اس کا تصور اتنا ہی تھا۔ آپؓ نے فرمایا۔ ہاں میں خدا کی تقدیر سے خدا کی تقدیر کی طرف بھاگ رہا ہوں تمہیں یہ سمجھ نہیں آتی کہ وہاں بھی تو خدا کی تقدیر ہے۔ ہمیں نظر آ رہا ہے کہ یہاں تقدیر شر ہے وہاں نظر آ رہا ہے کہ وہاں تقدیر خیر ہے بڑا ہی بے وقوف ہوگا جو تقدیر شر میں بیٹھ رہے کہ یہ خدا کی تقدیر ہے اسے چاروں طرف تقدیر خیر بھی تو دکھائی دینی چاہئے۔ کیسا عمدہ اور کیسا گہرا پر حکمت جواب تھا۔ تو خدا کی تقدیر سے بھاگنا تبھی جائز ہے اگر خدا کی تقدیر کی طرف ہو جہاں جھوٹ بولا خدا کی تقدیر کی بجائے شیطان کی تقدیر کی طرف ہجرت ہوگی۔ یہ ہے جو باریک مسئلہ سمجھنا ضروری ہے۔ بھاگنا منع نہیں تھا مگر اس یقین کے ساتھ کہ جہاں بھی میں جاؤں گا خدا کی تقدیر ہی کی طرف جاؤں گا لیکن اگر رستے میں پتا لگے کہ او ہو اللہ کی تقدیر وہاں تو بغیر جھوٹ بولے مل ہی نہیں سکتی تو پہلے شیطان سے جھوٹا سرٹیفکیٹ حاصل کر لوں۔ سرٹیفکیٹ تو مل جائے گا مگر تقدیر اُٹھ جائے گی۔ یہ وہ باریک پہلو ہیں جھوٹ کے جن پر نظر رکھیں تو پھر آپ کو حق کے

ساتھ تعلق قائم کرنے کی توفیق ملے گی۔

یہ جب میں نے خطبہ دیا تو اس کے بعد کئی مثالیں سامنے آئیں ایک خط اور چند دن ہوئے مجھے ملا اس میں لکھا تھا کہ آپ نے چونکہ نصیحت کی تھی کہ کسی حال میں بھی جھوٹ نہیں بولنا خواہ تمہیں واپس جانا پڑے۔ تو پہلا کیس جو تھا اس میں غلطیاں ہوگئیں تھیں کئی جھوٹ بولے ہوئے تھے اور کیس بھی بڑا گندا ہوا تھا۔ میں نے پھر فیصلہ کر لیا کہ اب جو کچھ بھی ہے بہر حال سچ بولنا ہے اور کہتے ہیں کہ میں جب عدالت میں پیش ہوا تو وکیل سامنے کھڑا تھا اس کے سامنے میں نے باتیں بیان کرنی شروع کیں۔ جج جو پوچھتا تھا میں بالکل سوچ کر، تول کر سچا جواب دیتا تھا۔ اس عرصے میں وکیل نے کہا کہ اس کے بزرگ بھی باہر کھڑے ہیں اگر آپ کو یہ شک ہو کہ شاید اس نے کوئی جھوٹ بولا ہو وہ سن تو نہیں رہے ان کو بھی بلا لیں اور ان کو باہر بھیج کے ان سے الگ انٹرویو لے لیں پھر آپ کو اندازہ ہو جائے گا تو جج اس کی سچائی سے اتنا متاثر ہو چکا تھا کہ اس نے کہا مجھے کسی اور گواہی کی ضرورت نہیں میں جانتا ہوں یہ شخص سچ بول رہا ہے اور اس کو میں نے ضرور یہاں اسائلم دینا ہے۔ اب وہ واقعات جو تھے وہ اپنی ذات میں اسائلم کمانے والے نہیں تھے لیکن سچ کی طاقت اور اس کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے اس کے حق میں فیصلہ فرما دیا۔

لیکن تنبیہ یہ ہے کہ اس وجہ سے یہ نہ سمجھیں کہ او ہو اسائلم لینے کا طریقہ ہی یہی ہے کہ سچ بولیں تو کبھی بھی انکار نہیں ہوگا۔ جب یہ خیال آپ کے دل میں آئے گا تو آپ خدا کی تقدیر پر حاکم بن جائیں گے۔ دعا نہیں کر رہے ہوں گے بلکہ اسے گویا امر دے رہے ہوں گے وہاں آپ کا نسخہ فیل ہو جائے گا۔ اس لئے دونوں احتمال اور امکان، دونوں طرف کے دروازے کھلے رکھیں، سچ بولیں، یہ عرض کریں اللہ تعالیٰ سے اگر اس کے نتیجے میں دنیا جاتی ہے تو مجھے کوئی پرواہ نہیں کیونکہ سب دنیا تیری ہی ہے۔ دوسرا پہلو اقتصادی پہلو ہے بعض لوگ بیچارے واقعۃً سب کچھ بیچ کے جس کو پنجابی میں کہتے ہیں ''ویچ وٹ کے'' جو غریب کی گلی، چھوٹا سا کوئی گھر وغیرہ تھا بستر سامان سب کچھ بیچ دیا کہ اس ملک سے نکلو۔ اب ان کو یہ فکر لاحق تھی ہم واپس جائیں گے کہاں، کیا کمائیں گے، کیا کھائیں گے، وہاں تو کچھ بھی نہیں رہا۔ ان سے میں نے کہا اب یہاں ربوبیت کا امتحان ہے پہلے اس بات کا امتحان تھا کہ

مالک کون ہے، حفاظت کرنے والا کون ہے، اَلْمُؤْمِنُ اور اَلْمُهَيْمِنُ (بنی اسرائیل: 24) کون ہے۔اب ربوبیت کا امتحان آپڑا ہے۔اگر آپ خدا کے سوا کسی کو رب سمجھتے ہیں تو پھر اسی رب سے مانگنے نکلے ہیں۔ اگر خدا ہی کو رب سمجھتے ہیں تو جو جرمنی کا رب ہے وہی پاکستان کا بھی رب ہے بالکل پرواہ نہ کریں۔ چنانچہ بعض ایسے معاملات بھی میرے علم میں آئے کہ اللہ کے فضل کے ساتھ یہ عجیب بات ہے کہ جس جس نے بھی سچ بولا ہے اب تک تو سب کو اللہ نے بچالیا ہے۔ یہ بعض دفعہ کمزوروں کی حمایت میں اللہ تعالیٰ نسبتاً نرم سلوک فرماتا ہے لیکن پھر بھی میں متنبہ کر دیتا ہوں کہ ضروری نہیں ہے کہ ہر کیس میں لازماً آپ کی پردہ پوشیاں ہی کی جائیں اگر اللہ نے آپ کو اس طرح آزمانا چاہا کہ اچھا واقعۃً تم میری خاطر تقدیر شر کے لیے بھی تیار تھے تو آؤ پھر میں یہ بھی دیکھ لیتا ہوں۔ اس کی بھی مثالیں موجود ہیں۔ حضرت ایوبؑ کی اسی طرح تو آزمائش ہوئی تھی اللہ چاہتا تو چند امتحانوں کے بعد ہی ان کو بخش دیتا۔ ان کا امتحان، ان کا ابتلا ختم کر دیتا، مگر قرآن بتا رہا ہے کہ اتنا لمبا دور امتحان کا آیا کہ عام آدمی تو عام آدمی بڑے بڑے اولیاء بھی اس سے بھاگ جائیں اور خوف زدہ ہو جائیں لیکن اللہ تعالیٰ نے حضرت ایوبؑ کو خود ہی سہارا دیا، خود ہی توفیق دی۔ اس لئے ابتلاؤں کا احتمال تو ہے لیکن ابتلاؤں پر اگر ثابت قدمی کی توفیق مل جائے تو بعض دفعہ یہ انعام ابتلاؤں کے بغیر انعام سے زیادہ بڑھ کر ہوا کرتا ہے بلکہ یقیناً زیادہ بڑھ کے ہوتا ہے اگر ابتلاء پر کوئی قائم رہ جائے اور صبر کے نمونے دکھائے اور سر تسلیم خم کئے رکھے، کوئی شکوہ زبان پر نہ لائے تو اس پر اللہ تعالیٰ ہمیشہ زیادہ مہربان ہوتا ہے۔ تو حضرت ایوبؑ کا بھی یہی سلسلہ تھا ایک لمبے عرصے تک آزمائش میں ڈالا اور حضرت ایوبؑ کو ثابت قدم پایا۔ یہاں تک کہ بائبل نے تو ایسا خوفناک نقشہ کھینچا ہوا ہے کہ اپنے رشتے دار چھوڑ گئے بیوی نے قطع تعلقی کر لی اور شہر والے باہر گندگی کے ڈھیر پر ڈال گئے کہ اتنی گندی بیماری ہے کیڑے پڑے ہوئے ہیں اس لئے ان کو وہاں پھینک دو اور جو لوگ نظر ڈالتے تھے وہ کراہت سے منہ دوسری طرف کر لیتے تھے لیکن اللہ نے ان کو قائم رکھا اپنی وفا کے ساتھ خدا تعالیٰ کی ہستی پر ایمان، اس پر یقین محکم میں کوئی تزلزل واقع نہیں ہوا پھر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے نِعْمَ الْعَبْدُ (ص:31) میرے بندے ایوب کو دیکھو ہمیشہ کے لئے ان پر سلام بھیجا گیا اتنے پیار سے ذکر ملتا ہے بار بار نِعْمَ الْعَبْدُ کیسا

اچھا بندہ تھا تو ہزار جو مصیبتیں تھیں وہ خدا تعالیٰ کے ایک نِعْمَ الْعَبْدُ پر قربان حسرت تو یہاں تک کہتا ہے (مجھے شعر یاد تھا ایک مصرعہ ذہن سے نکلا ہوا ہے میں بتا دیتا ہوں دوسرا) وہ کہتا ہے:

صحتیں لاکھوں مری بیماری غم پر نثار
جس میں اٹھے بارہا ان کی عیادت کے مزے (دیوان حسرت)

کہتا ہے میری لاکھوں صحتیں ایک بیماری غم پہ نثار ہو جائیں جس میں میرے محبوب نے کئی بار میری عیادت کی ہے وہ اللہ جس نے ایوبؑ کی عیادت کی جس نے اس کے ذکر کو پیار کے ساتھ ہمیشہ دوام بخش دیا ایک آزمائش کیا ایسی ہزار آزمائشیں ان خدا کی عیادتوں پر قربان۔ تو ابتلاء سے بھی اس طرح گھبرانا نہیں چاہئے کہ ابتلاء آ گیا تو مارے گئے، ابتلاء آیا تو وہ مارے جائیں گے جو بے وفا ہوں گے، وفاداروں کو ابتلاء کچھ نہیں کہتا۔

چنانچہ اس کی ایک دوسری مثال ایک اور شکل میں ملتی ہے ایک خدا کا بندہ عبادت گزار بڑی شہرت رکھنے والا ایسا تھا کہ وہ جب ایک غار میں جا کر پناہ گزین ہوا تو ساری مخلوق خدا کا رخ خدا نے اس طرف پھیر دیا۔ وہ اپنی طرف سے دنیا کو چھوڑ کر ایک پہاڑی کی کھوہ میں جا بیٹھا تھا اور اس نے اپنے رزق کی کوئی پرواہ نہیں کی لیکن لوگوں کے دلوں میں ڈالا گیا کثرت سے نعمتیں اس کی طرف روانہ ہونی شروع ہوئیں ہر ضرورت اس کی پوری ہونی شروع ہوئی وارے نیارے ہو گئے۔ پھر وہ خدا جو ایوبؑ کا خدا تھا اس نے کہا اس کی بھی تو میں آزمائش کر کے دیکھوں۔ بڑی میں نے نعمتیں دی ہیں دیکھوں تو سہی کیسا شکر گزار بندہ ہے۔ جب آزمائش کی تو کچھ دن ایسے آئے کہ ہر ایک سمجھا کہ اتنے لوگ جاتے ہیں، اتنی نعمتیں جا رہی ہیں، آج میں نہ گیا تو کون سا فرق پڑے گا اور شہر کے شہر کا رخ بدل گیا۔ تمام مرید اور اعتقاد رکھنے والے اس خیال سے کہ ہزاروں بندے خدا کے جا رہے ہیں ہم نہ گئے آج تو کیا فرق پڑتا ہے، اتفاق نہیں بلکہ خدا کی تقدیر کے تابع چند دن کے لیے اکٹھے رک گئے۔ جب بھوک کی شدت بڑھی تو غار چھوڑی شہر میں گیا اور ایک دروازہ کھٹکھٹایا اور بھیک مانگی میں بھوکا ہوں مجھے کچھ دو اس نے دو روٹیاں لا کر کچھ لگا یا یا نہیں لگایا ساتھ، روٹیاں لا کے دے دیں جب وہ چلنے لگا تو کتا جو باہر چوکھٹ پہ بیٹھا تھا وہ لالچ سے دیکھنے لگا اور آنکھوں میں ایسی تمنا تھی کہ اس نے کہا چلو اس کو

بھی تھوڑی سی روٹی ڈال دوں۔ایک ٹکڑا دیا پھر بھی اس کی طلب کم نہ ہوئی اور بھی بھڑک اُٹھی۔ وہ چلتا تھا تو پیچھے بھونکتا تھا کہ مجھے اور دو۔ یہاں تک کہ دونوں روٹیاں اسے دے دیں اور کہا بڑا ہی ذلیل جانور ہے تو۔میں تیرے مالک سے لے کے آیا ہوں اور تو نے مجھے یہ دو روٹیاں بھی نہیں کھانے دیں، اتنا حریص ہے۔تو اللہ تعالیٰ نے الہاماً اس کو فرمایا کہ تو زیادہ حریص ہے کہ یہ کتا زیادہ حریص ہے۔اس نے بہت بھوک دیکھی ہے اس مالک کے گھر پر اگر بھوکا نہ ہوتا تو اس طرح تیرے پیچھے نہ پڑتا لیکن مالک کی چوکھٹ نہیں چھوڑی۔ تجھے ساری عمر کے بعد چند دن کی بھوک میری چوکھٹ پہ دیکھنی پڑی اور تو چوکھٹ چھوڑ کر اُٹھ کھڑا ہوا اور دوڑ پڑا اس کا یہ حال بیان کیا جاتا ہے کہ وہ زاروقطار روتا ہوا واپس اپنے غار کی طرف دوڑا کہ واقعی ہی میں اس کتے سے بدتر انسان ہوں تو آزمائشیں بتاتی ہیں کہ کون قریب تر ہے اور کون دور تر ہے اور وہ لوگ جو اپنے دنیا کے مالکوں سے بھی پیار اور محبت اور وفا کا سلوک کرتے ہیں اور آزمائشوں پہ ثابت قدم رہتے ہیں ان کی قدرومنزلت بڑھا کرتی ہے۔

پس کسی قیمت پر بھی آپ کو حق سے اپنا تعلق نہیں کاٹنا۔جھوٹ کے خدا جگہ جگہ آپ کی راہ میں کھڑے ہوں گے ہر ایک آواز دے رہا ہوگا کہ میری طرف آؤ میں تمہاری حاجت روائی کرتا ہوں لیکن جھوٹ کے خدا جھوٹے ہوتے ہیں ان کی حاجت روائیاں بھی جھوٹی ہوتی ہیں، وہ تسکین سے عاری ہوتی ہیں ان کا حال سراب کا سا حال ہے کہ پیاسا جب اس کی طرف بڑھتا ہے تو پانی سمجھتے ہوئے جاتا ہے مگر وہاں جاتا ہے تو اللہ کو پاتا ہے کہ وہ اس کا حساب دینے کے لئے کھڑا ہے۔پس سچائی کا دامن پکڑ لیں اور بڑی قوت اور مضبوطی کے ساتھ اس کا دامن پکڑ لیں۔اگر حق خدا سے تعلق قائم کرنا ہے تو آپ کو حق بننا ہوگا اور حق بننے کے رستے میں جو مشکلات کھڑی ہیں ان کا مقابلہ کرنا ہوگا۔پھر دیکھیں کہ آپ کے اندر کیسی نئی طاقت پیدا ہوتی ہے۔وہ لوگ جو سچ پر قائم ہوں ان کو نئی تخلیق ملتی ہے، وہ خدا کی طرف سے پھر رب بھی بنائے جاتے ہیں، رحمٰن بھی بنائے جاتے ہیں، رحیم بھی بنائے جاتے ہیں اور مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ بھی بنائے جاتے ہیں لیکن اپنے دائرے کے مطابق تخلیق کے دائرے کے اندر رہتے ہوئے نہ کہ خدا کے دائرے میں داخل ہو کر۔

قرآن کریم نے حق کا تعلق جو بیان فرمایا ہے مختلف جگہوں پر ان کی ساری آیات تو سامنے پیش نہیں کی جاسکتیں یہ بہت وسیع مضمون ہے مگر میں اگلے خطبے میں انشاء اللہ مثال کے طور پر آپ کو

بتاؤں گا کہ کس طرح خدا تعالیٰ حق کا تعلق مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ سے بھی جوڑتا ہے۔ رحمانیت اور رحیمیت سے جوڑنے کے بعد آخر مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ تک پہنچ جاتا ہے اور اس مضمون کو خوب کھول دیتا ہے۔ پس سب نے جانا تو وہیں ہے۔ اگر یہاں حق بن رہے ہوں گے تو وہاں سب کچھ ساتھ ہے اگر یہاں حق سے تعلق ٹوٹ گیا تو آگے حق ہی حق ہوگا۔ اس لئے انشاء اللہ اگلے خطبے میں مَیں کچھ مزید روشنی ڈالوں گا تا کہ اسماء باری تعالیٰ کا مضمون سمجھ کر ہمارے اندر ایک نئی روح پیدا ہو جائے، ایک نئی تخلیق ہمیں عطا ہو جو دراصل روحانی تخلیق ہے اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین